محسنِ انسانیت (صلی اللہ علیہ وسلم)

(مخالفتوں کے طوفان سے گذرتے ہوئے)

——— مدنی دَور ———

نعیم صدیقیؒ

——— بسلسلہ گذشتہ ———

تحریک کا نیا مرکز تحریکِ حق کا آسمانی لیڈر برابر اس سوچ میں رہا کہ اگر مکہ کے ظرف میں سمائی نہیں اور یہاں کی سنگین قیادت "جہانِ نو" کی تاسیس کا موقع دینے پر تیار نہیں ہے تو پھر زمین کا اور کونسا گوشہ ہو سکتا ہے جہاں طاقت کو سمیٹ کر تعمیری کام شروع کیا جا سکے۔ پہلے نگاہ حبش پر گئی اور اسی لیے ساتھیں کو وہاں بھیجا۔ اگرچہ شاہِ نجاشی نے مظلومینِ مکہ کی حمایت کا حق ادا کر دیا، لیکن ایک تو وہاں کے عیسائی علماء کا گھٹیا کردار سامنے آ چکا تھا اور ان کے چھائے ہوئے اثر کے تحت دینِ حق کا پنپنا آسان نہ تھا۔ دوسرے وہاں کی مقامی آبادی میں بالکل نئے سرے سے کام کرنے کی ضرورت تھی اور اس میں اجنبیت کے بہت سے وجوہ حائل نظر آتے تھے، اس لیے کسی دوسرے گوشے کی تلاش تھی۔ مدینہ نے جب کھلے دل سے دعوتِ حق کو لبیک کہی تو سرمدِ عالم کو امید کی ایک نئی جھلک نظر آئی۔ بیعتِ عقبہ اولیٰ نے اس امید کو مستحکم تر کر دیا۔ پھر مصعبؓ بن عمیر نے خود وہاں رہ کر اور کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد بیعتِ عقبہ ثانیہ والے موسمِ حج میں حج سے کچھ قبل آ کر حضورؐ کی خدمت میں پوری رپورٹ پیش کی۔ مدینہ کے مسلمانوں کی تفصیل بیان کی، اُن کی قوت کا حال بتایا اور خوش خبری دی کہ وہ امسال بڑی تعداد میں آ رہے ہیں۔ اس رپورٹ نے حضورؐ کو غور و فکر کی دعوت دی۔ یہ صورت فی الواقع بڑی خوش آئند تھی کہ مدینہ کے مسلمان تعداد اور قوت کے لحاظ سے دن دن، رات رات بڑھ رہے تھے اور پھر یہود کی طرف سے اس طرح کی سنگین

مخالفت کا ان کو سامنا نہیں کرنا پڑ رہا تھا جیسے ان کے مکی ساتھیوں کو قریش کی طرف سے درپیش تھی۔ اور اہلِ یثرب مکہ والے رفقاء کے لیے بالعموم کڑھتے تھے، ان کو بہت زیادہ سہولتیں حاصل تھیں، ان کے ہاں کھیتیاں تھیں اور نخلستان اور تاکستان تھے۔ حضورؐ سوچتے تھے کہ کیا یہ اچھا نہ ہو کہ مکہ کے رفقاء مدینہ چلے جائیں اور قریش کے مظالم سے نجات پاکر دین کے تقاضے پورے کریں۔ چنانچہ آنے والے وفد میں جو لوگ محرم تھے ان سے آپؐ نے اس خیال کا اظہار بھی فرما دیا۔ اور بعد میں جس شکل میں پیمان باندھا گیا وہ اسی پس منظر کے ساتھ تھا۔[1]

یوں تو ہجرتِ حبشہ سے مہاجرین کے لوٹ آنے کے بعد ہی سے اکا دکا رفقاء آپؐ کی اجازت سے مدینہ جاتے رہے، لیکن بیعتِ عقبۂ ثانیہ کے بعد رفتار تیز ہو گئی اور تقریباً طے ہو گیا کہ دوسرا دار الہجرت مدینہ ہی ہو گا۔

سوادِ اہلِ مکہ دیکھ رہے تھے کہ تحریکِ اسلامی نے ایک نیا مضبوط مرکز پیدا کر لیا ہے۔ ان کی نگاہوں میں مستقبل بڑا بھیانک ہو ہو کر آنے لگا۔ وہ اپنی جگہ خوب سمجھ رہے تھے کہ اب اگر مدینہ میں کلمۂ حق کی جڑ لگ جاتی ہے تو ہمارے حدودِ اثر سے باہر ہی باہر یہ کلمہ ایک ناقابلِ شکست طاقت بن کر ایک دن ہماری ہی خبر لے گا اور ہمیں کو اپنے کرتوتوں کا حساب پائی پائی ادا کرنا ہو گا۔ وہ اس خطرے کو بھی محسوس کر رہے تھے کہ شام کی تجارتی شاہراہ چونکہ مدینہ سے ہو کر گزرتی ہے اس لیے مدینہ کا نیا اسلامی مرکز شاہراہ کی ناکہ بندی کر سکے گا اور اس طرح ان کی معاشی شاہ رگ کٹ جائے گی۔ ان پر اندر ہی اندر گھبراہٹ کا شدید دورہ پڑ چکا تھا، مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کریں کیا؟ وہ دن رات اس اندیشے میں رہنے لگے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی پوری جماعت کہیں ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ اسی اندیشے کے زیرِ اثر وہ بالآخر صاحبِ نبوتؐ کے قتل کے منصوبے بنانے پر اتر آئے۔ ایک تاریخی طاقت جو ان کے اپنے گھر سے ابھری اور ساری دنیا سے زیادہ وہ ان کی اپنی تھی؛ اسے اپنے ہی کرتوتوں سے "غیر" بنا دیا اور خود اس کے دشمن بن کھڑے ہوئے، پس اب جوں جوں وہ زور پکڑتی تھی ان کے لیے ایک جان لیوا

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ حیاتِ محمد از محمد حسین ہیکل مصری ص ۲۰۲۔

خطرہ بنتی جاتی تھی۔

چنانچہ پہلا مہاجر جب مدینہ کے ارادے سے نکلا تو مکہ والوں نے اس کے ساتھ جفاکارانہ معاملہ کیا۔ یہ اوّلین مہاجر ابوسلمہ عبداللہ بن الاسد مخزومی تھے۔ یہ بیوی بچے کو اونٹ پر سوار کر کے نکلے۔ ان کی بیوی بنو مغیرہ میں سے تھیں، وہ لوگ عین روانگی کے وقت تندی میں آئے اور ام سلمہؓ کے اونٹ کی مہار یہ کہہ کر ابوسلمہ سے چھین لی کہ اسے ہم تیرے ساتھ در در پھرنے کے لیے کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ اس جذباتی صورت حالات نے ابوسلمہ کے قبیلہ والوں میں سخت ردعمل پیدا کر دیا۔ انہوں نے بنو مغیرہ سے کہا کہ اگر تم ہمارے آدمی سے اس کی جورو کو یوں چھینتے ہو تو پھر ہم اپنا ننھا بچہ اس کی گود میں نہ رہنے دیں گے، چنانچہ شوہر، بیوی اور بچہ تینوں باہم کر بچھڑ گئے اور اس عالم میں ابوسلمہ نے کوچ کیا۔ ام سلمہ نت صبح کو آکر شہر سے باہر اسی موقع پر آکر زار قطار رونے لگتیں۔ آخر سال بھر کے بعد کسی کو رحم آگیا اور اس نے بنو مغیرہ سے کہہ سن کر اونٹ پر سوار کرا کے ام سلمہ کو بچے سمیت مدینہ روانہ کرا دیا اور وہ تن تنہا چل کھڑی ہوئیں۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک مقام پر عثمان بن طلحہ مل گئے اور انہوں نے اس مہاجرہ کو حوالیٔ مدینہ میں پہنچا دیا۔

یعنی ہجرت حبشہ کے تلخ تجربے کے بعد اب پالیسی یہ ٹھہری کہ خدا پرستانہ نظام زندگی کے علمبرداروں کو اپنے قابو سے نکلتے ہوئے روکا جائے۔ وہ نکلیں تو ایسی حالت میں نکلیں کہ ان کا کنبہ قبیلہ بطور یرغمال مکہ والوں کے پاس رہے۔ یہ پالیسی شروع میں ذرا ڈھیلی ڈھالی تھی لیکن رفتہ رفتہ اس میں سختی بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ اور عیاش ابن ابی ربیعہ اور ہشام بن العاص بن الوائل دور آخر میں ایسے عالم میں چھپ چھپا کر نکلے کہ ہر وقت دھڑکا تھا کہ کہیں گرفتار نہ ہو جائیں۔ حضرت عمر اور عیاش تو نیز رفتاری سے نکل گئے لیکن ہشام کو پکڑ لیا گیا اور وہ شکنجۂ استبداد میں آگئے۔ حضرت عمر اور عیاش بخیریت مدینہ پہنچ گئے۔ مکہ سے ایک سازشی وفد ان کے پیچھے روانہ ہوا۔ یہ ابوجہل بن ہشام اور حارث بن ہشام پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ جا کر عیاش سے ملے اور کہا کہ تمہاری والدہ کا حال ابتر ہے اور اس نے قسم کھائی ہے کہ جب تک تم سے نہ ملے گی سر کے بال نہ سنوارے گی اور چلچلاتی دھوپ میں کھڑی رہے گی۔

ساتھیوں نے سمجھایا کہ یہ واضح طور پر ایک چال ہے، تم ایک بار مکہ والوں کے پھندے میں پھنس گئے تو یہ تمہیں دین سے ہٹا دیں گے۔ عیاش کو ایک لالچ یہ بھی تھا کہ وہ مالدار آدمی تھے اور کچھ مال نکال لانا چاہتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے پیش کش کی کہ میں اس سے زیادہ مال رکھتا ہوں اور تم مجھ سے آدھا مال لے لو، ان دونوں کے ساتھ نہ جاؤ۔ عیاشؓ نہ مانے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اچھا اگر یہی طے ہے تو میری اصیل اونٹنی لے جاؤ، جہاں کوئی اندیشہ محسوس ہو، بھاگ نکلنا۔ مگر مکی سازشیوں نے راستے میں ایسی چال چلی کہ اصیل اونٹنی سے فائدہ اٹھانا بھی عیاش کے بس میں نہ رہا اور ان کی مشکیں کس لی گئیں۔ اہلِ وفد جب مکہ پہنچے تو انہوں نے لوگوں سے کہا کہ دیکھو، یوں علاج کرو اپنے اپنے عقل کے ماروں کا جیسے ہم نے کیا ہے۔

بعد میں حضرت عمرؓ نے دستِ خاص سے ایک خط ہشام بن العاص کو لکھا اور اس میں مشہور آیت "یٰعبادی الذین اسرفوا ۔۔۔۔ الخ" درج کی۔ اس خط کو مکہ کے پاس "ذی طوٰی" نامی موقع پر ہشام نے پڑھا، بار بار غور کیا اور جب بات پالی کہ اس میں اشارہ خود اس کی جانب ہے تو فوراً اونٹ لیا، کجاوہ کسا اور روانہ ہو گیا۔ لیکن اس سے زیادہ مضبوط روایت یہ ہے کہ جب آنحضور صلعم مدینہ تشریف لا چکے تو ایک دن مجلس میں ان دونوں محبوسین کا ذکر چھڑا۔ آپؐ نے فرمایا "عیاش بن ابی ربیعہ اور ہشام بن العاص کو نجات دلانے کے لیے کون مجھے اپنی خدمات سونپتا ہے؟" ولید بن مغیرہ نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ ولید حکمِ نبوی کے مطابق مکہ روانہ ہو گئے۔ چھپتے چھپاتے آبادی کے قریب آئے ایک عورت کھانا لے جاتی نظر آئی۔ پوچھا "اللہ کی بندی، کدھر کو جا رہی ہو؟" اس نے جواب دیا کہ "یہاں دو قیدی ہیں، یہ کھانا ان کے لیے ہے۔" ولید پیچھے ہو لیے۔ وہی دونوں تھے اور ایک بے چھت کے مکان میں بند تھے۔ شام ہو گئی تو یہ دیوار پھاند کر اترے۔ ان کی بیڑیوں کے نیچے پتھر رکھ کر اپنی تلوار سے ان کو کاٹ ڈالا۔ پھر باہر نکال کر دونوں کو اونٹ پر بٹھایا اور راہ فرار اختیار کی۔

اسی طرح کثیر لوگ خود اگر نکلے بھی تو مکہ والوں نے ان سے ان کے اموال رکھوا لیے۔ جیسے تجارت سے جانیں بچا کر نکلنے والے بہت سے مسلمانوں کے ساتھ ہوا۔

لیکن ہجرت کے اس درجہ جگر آزما ہونے کے باوجود مرد ہی نہیں، خواتین بھی برابر جادۂ فرض پر اقدام کر رہی تھیں۔ تحریک اسلامی کا یہ اعجاز اپنی مثال نہیں رکھتا کہ آج سے صدیوں پہلے کے وحشی عرب کی اَن پڑھ خواتین تک میں اس زندگی بخش طاقت نے ایک زوردار حرکت عمل پیدا کر دی۔

مہاجرین کے راستے میں رکاوٹیں ڈال کر قریش اپنی بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ مگر دوسری طرف جس شخصیت سے سابقہ تھا وہ عالی حوصلگی کی اونچی چوٹی پر کھڑی تھی۔ وہاں سمندر کا سا وسیع ظرف تھا۔ وہ پیکرِ صبر و استقلال ٹھنڈی عزیمت اور ٹھہراؤ والی فطرت سے آراستہ تھا۔ چنانچہ وہ اپنے مرکز دعوت پر ڈٹا رہا۔ اسے آخری حد تک اتمام حجت کا فریضہ ادا کرنا تھا۔ وہ اہلِ مکہ کے خلاف مشیت الٰہی کے کھیل کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے اپنا فرض صبر و تحمل سے ادا کر رہا تھا۔ اس کی مثال ڈوبتے جہاز کے بہادر کپتان کی سی تھی کہ جو سارے عملے اور سارے مسافروں کو سلامتی کی کشتی پر سوار کرنے کے بعد سب سے آخر میں جہاز کو چھوڑنے والا تھا۔

جب بجز ایسے چند افراد کے کوئی باقی نہ رہا جنہیں قریش کے جبر نے محصور کر رکھا تھا یا جن کو کسی مفاد یا مصلحت نے باندھ رکھا تھا تو اس وقت آپؐ کو آسمانی حکومت کی طرف سے پروانۂ ہجرت ملا۔ آپؐ نکلے تو ایسے عالم میں نکلے جبکہ مکہ والے آپؐ کو زندہ دیکھنے کے روادار نہ رہے تھے۔ اور جب نکلنے کی گھڑی آگئی تو خون کی پیاسی تلواروں کے گھیرے میں سے آپؐ بے خوفی کی شان سے نکل گئے۔

مدینہ — ہمہ تن انتظار مہاجرین کی تعداد جوں جوں بڑھ رہی تھی مدینہ میں زندگی کی رَو زور پکڑ رہی تھی۔ دعوتِ حق کا اُجالا آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اور جتنا جتنا اسلام دلوں کی دنیاؤں کو فتح کرتا جاتا تھا اسلام کا پیغام لانے والے محسن کی محبت بڑھتی جاتی تھی۔ خصوصاً بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد سے مدینہ کی چشمِ انتظار ہر دم مکہ سے آنے والے راستے پر لگی رہنے لگی۔ ایک فصل لہلہا رہی تھی اور اس انتظار میں تھی کہ ابرِ کرم آئے اور برس جائے۔ ایک چمن لالہ و گل آراستہ تھا اور امیدوار تھا کہ بادِ بہاری کے جھونکے آئیں اور رنگ و بو کے طوفان اُبل پڑیں۔ سارا مجمع پڑا تھا اور ہمہ تن آرزو تھا کہ معمارِ انسانیت آئے اور تعمیر نو بپا کر دے۔

ہوا کی لہریں یہ اطلاع بھی کسی نہ کسی طرح لے آئیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے نکل چکے ہیں اور جادۂ ہجرت کے مراحل طے کر رہے ہیں۔ اس خبر پہ مدینہ میں اشتیاق کے جذبات اضطراب کی حد کو پہنچ گئے ہونگے۔ انتظار کی بے چینیاں زور پکڑ گئی ہونگی۔ سوچو کہ ہر طرف کیا چرچے ہونگے؟ کیا استفسار ہوا کرتے ہونگے؟ کیسی گفتگوئیں محفلوں کی رونق رہتی ہونگی؟ جذبات و احساسات کا کیا عالم ہوگا۔ مشرکین کا، یہود کا، انصار کا، مسلمانوں کا؟

چھوٹے چھوٹے بچوں کی زبانوں پر یہی بات رہنے لگی کہ رسول آ رہے ہیں، رسول آ رہے ہیں۔ لوگ ہر صبح گھروں سے نکلتے اور شہر سے باہر جمع ہو کر انتظار کرتے، جب گرما کا سورج اونچا ہو جاتا اور دھوپ قابلِ برداشت نہ رہتی تو حسرت زدہ ہو کر لوٹ جاتے۔ یوم قدومت کو بھی لوگ اسی طرح جمع ہو کر لوٹ رہے تھے کہ ایک یہودی نے قلعے پر سے دیکھا اور مژدہ سنایا کہ "اہلِ عرب! لو تمہیں جس بزرگ کا انتظار تھا وہ آ پہنچے"۔ تمام شہر تکبیر کے غلغلے سے گونج اٹھا۔ لوگ بے تابانہ وار دوڑے۔ اکثر انصار خوب ہتھیار لگا لگا کر نکلے۔

اولین قیام مقام قبا میں ہوا جو مدینہ سے تین میل کے فاصلے پر ایک مضافاتی آبادی تھی۔ عمرو بن عوف کے خاندان نے نعرہ ہائے مسرت کے ساتھ استقبال کیا اور اسی خاندان کو شرف میزبانی حاصل ہوا۔ یہ گھر دراصل تحریکِ اسلامی کا ایک مرکزی اڈہ (CELL) تھا۔ مہاجرین میں اکثر کے لیے منزلِ اول یہی گھر بنا اور بعض مہاجر صحابی اس وقت بھی یہیں مقیم تھے۔ حضرت علیؓ بھی امانتوں کی ادائی کے بعد روانہ ہو کر یہیں کاروانِ محبوب کے ساتھ آ ملے۔ یہاں چودہ روز قیام رہا اور مہاجرین و انصار جوق در جوق شرفِ ملاقات کو آ رہے تھے۔ لوگ اس ہستی کو دیکھنا چاہتے تھے جس کا پیغام ان کے سینوں میں گھر کر چکا تھا۔ اس کے چہرے کی ایک جھلک نگاہوں کے دامن میں سمیٹ لینا چاہتے تھے۔ اس کے منہ سے میٹھے بول سننا چاہتے تھے، اس کی دعائے خیر سے حصہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ غائبانہ عقیدت اب محسنِ انسانیت کو رو در رو دیکھنا چاہتی تھی۔ سلام، ملاقاتیں، گفتگوئیں، دعائیں، مجلسیں، کیا کچھ نہ ہو رہا ہوگا۔

قبا میں آپ نے اپنے ہاتھوں سے ایک مسجد کی بنا رکھی۔ ایک ایک مسلمان اس تعمیر کی مہم میں شریک تھا اور خود دنیا کا سب سے بڑا تاریخ ساز ایک معمولی مزدور کی طرح بھاری بھرکم پتھر اٹھا اٹھا کر لا رہا تھا۔ کام ہو رہا تھا اور ساتھ کے ساتھ گیت گایا جا رہا تھا۔

افلح من یعالج المساجدا　　ویقرء القرآن قائماً وقاعدًا

ولا یبیت اللیل عنہ راقدًا

یعنی کامیاب وہ ہے جو مسجدیں تعمیر کرے، اٹھتے بیٹھتے قرآن پڑھے اور راتوں کو (عبادت کے لیے) جاگے۔

یہ مسجد محض اینٹ پتھر اور گارے اور پھونس کا مجموعہ نہ تھی، اس میں خاتم النبیین سے لے کر ایک عامی مسلمان تک ہر ایک نے اپنے بہترین جذبات صرف کیے تھے۔ اسی لیے اس کی شان میں قرآن نے کہا: "لمسجدٌ اُسِّسَ علی التقوی"۔ یہ ایسی مسجد ہے کہ اس کی بنیاد تقویٰ پر استوار کی گئی ہے۔

قبا میں ورود ۸ ربیع الاول سالہ (نبوی) بروز جمعرات ہوا تھا۔ چودہ روز بعد انسانِ اعظم نے رفقاء سمیت مدینہ کا رخ کیا۔ قبا سے مدینہ تک دو رویہ انصار خیر مقدم کے لیے صفیں باندھے کھڑے تھے۔ آپ کے ننھیالی رشتہ داروں نے خاص اشتیاق سے ہتھیار لگائے۔ عورتیں چھتوں پر جمع تھیں اور ترانۂ خیر مقدم گا رہی تھیں۔

طلع البدر علینا　　من ثنیات الوداع

وجب الشکر علینا　　ما دعا للہ داع

اور چھوٹی بچیوں کے غول گھوم رہے تھے، یہ لڑکیاں دف بجا بجا کر گاتی پھرتی تھیں۔

نحن جوار من بنی نجار　　یا حبذا محمدًا من جار

ان بچیوں کی پاکیزہ محبت کا جواب سرورِ عالم نے بھی خاص شفقت سے دیا۔ ان سے باتیں کیں۔ پوچھا کہ "کیا تم مجھے چاہتی ہو؟" انہوں نے کہا "جی ہاں!" آپ نے فرمایا کہ "میں بھی تم کو چاہتا ہوں"[1]۔

ذرا تصور میں لائیے اس تاریخی گھڑی کو جو مدینے کے نصیب میں آئی تھی۔ گلیوں کی خاک کے ذرے ذرے میں دل دھڑک رہے ہوں گے۔ دیواروں کی درزوں کو آنکھیں مل گئی ہوں گی۔ ہوا کے جھونکوں میں انسانی احساسات

---

[1] سیرت النبی ج ۱ ص ۲۰۲-۲۰۳۔

پیدا ہو گئے ہونگے۔

عارضی قیام کے لیے حضرت ابوایوب انصاری کے گھر کی قسمت جاگی۔ سات ماہ نبی اکرم کا قیام یہیں رہا۔

تعمیری اقدامات | جونہی ذرا سکون ہوا اور مسافرت کی کیفیت ختم ہوئی تو سرورِ عالم تعمیری اقدامات کی طرف متوجہ ہوئے۔ اولین مہم مسجد کی تعمیر کی تھی۔ دو یتیم بچوں کی افتادہ زمین خریدی گئی اور حضرت ابوایوب انصاریؓ ہی نے قیمت ادا کی۔ اس زمین پر مسجد نبوی کی تاسیس ہوئی۔ مسجد کی اہمیت صرف بطور معبد ہی کے نہ تھی بلکہ اسے اسلامی نظام تمدن و ریاست کا سرچشمہ و مرکز بننا تھا۔ وہ حکومت کا دربار، مشورے کا ایوان، سرکاری مہمان خانہ، جمہوری دارالعلوم اور قومی کلچرہال کی حیثیت سے برپا کی گئی۔ اس اولین تعمیری اقدام پر وہی قبادالانتشہ پیش آیا۔ کون مسلمان ہو گا جس نے اس میں دل و جان سے حصہ نہ لیا ہو گا۔ خود سرورِ عالم پتھر اور گارا اُٹھا اُٹھا کر لاتے۔ اس منظر کو دیکھ کر ایک مسلمان مارے جذبات کے پکار اُٹھا کہ:

لئن قعدنا والنبیُّ یعملُ لذاک منّا العمل المضلّلُ

یعنی اگر خدا کا نبی اس کام میں یوں لگ جائے اور ہم بیٹھے دیکھتے رہیں تو ہمارا کیا کرایا غارت ہوا۔

کام کی گرماگرمی میں کوئی بیہودہ گوئی نہ تھی، بلکہ آنحضورؐ سمیت سب کے سب یہ صدا بلند کر رہے تھے:

لا عیش الا عیش الآخرہ اللّٰھم ارحم الانصار والمہاجرہ

یعنی آخرت کی ابدی زندگی ہی زندگی ہے اور وہ نہ ہو تو پھر زندگی ہیچ ہے۔ اے اللہ! تو انصار اور مہاجرین پر رحم فرما۔[1]

یہ تھی اسپرٹ اور یہ تھیں دعائیں جو مسجد نبوی کی تعمیر کا اصل مسالہ بنیں۔ مسجد کے ساتھ محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے گارے اور پھونس کے حجرے (کوارٹرز) تعمیر ہو گئے۔ آپ اپنے انہی کوارٹرز میں منتقل ہو گئے۔

مدینہ میں حضرت رسالت مآب کی تشریف آوری سے از خود دعوت کا دائرہ وسیع ہونے لگا اور اس سات ماہ کے عرصے میں تحریک حق نے قبیلے قبیلے اور گھر گھر سے جان نثار حاصل کر لیے۔ صرف خطمہ، واقف، وائل اور امیہ کے گھرانوں میں شرک کی تاریکی باقی رہ گئی، اور ان سب کا تعلق قبیلہ اوس سے تھا۔[2]

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۱۴۱-۱۴۲ [2] ایضاً ص ۱۴۶

تیسری مہم کے سلسلے میں کارِ دعوت کا آگے بڑھانا درجۂ اول کی اہمیت رکھتا تھا۔ انفرادی دعوت کے علاوہ سرورِ عالم نے اجتماعی طور سے کام کا آغاز جس خطابِ عام سے کیا وہ ان الفاظ پر مشتمل تھا۔

(حمد و ثنا کے بعد) ــ "لوگو! اپنی جانوں کے لیے وقت پر کچھ کمائی کر لو، خوب جان لو خدا کی قسم تم میں سے ہر ایک پر موت وارد ہوگی اور وہ اپنے گلّے کو اس حال میں چھوڑ کر رخصت ہوگا کہ کوئی اس کا چرواہا نہ رہے گا، پھر اسے اس کے پروردگار کی طرف سے ایسے عالم میں خطاب کیا جائیگا جبکہ بیچ میں کوئی ترجمان اور دربان نہ ہوگا۔ کہا جائے گا کہ کیا تجھ تک میرا رسول نہیں پہنچا تھا، جس نے بات تجھ تک پہنچائی ہو؟ پھر کیا میں نے تجھے مال نہیں دیا تھا اور تجھ پر نوازش نہیں کی تھی؟ تو پھر اپنی جان کے لیے تو نے کیا اندوختہ کیا؟ پس وہ دیکھے گا دائیں بائیں، لیکن کچھ نہ دکھائی دیگا۔ پھر سامنے کی طرف نگاہ ڈالے گا، مگر بجز جہنم کے اور کچھ سامنے نہ آئے گا۔ سو جس کسی کو بھی توفیق ہو کہ وہ کھجور کی ایک پھانک کے عوض بھی اپنے چہرے کو دوزخ کی آگ سے بچانے کے لیے کچھ کر سکتا ہو تو کرے۔ جو اتنا بھی نہ کر سکے وہ کوئی بھلی بات کہہ کر ہی بچاؤ کرے۔ کیونکہ نیکی کا بدلہ دس گنا سے لیکر سات سو گنا تک ملتا ہے۔ اور تم پر سلامتی ہو اور اللہ کی رحمتیں اور برکتیں وارد ہوں۔"[1]

دوسرا خطابِ عام جو آپ نے فرمایا، یہ تھا۔

"ساری تعریف اللہ کے لیے ہے۔ میں اسی کی حمد کرتا ہوں، اسی سے مدد چاہتا ہوں، ہم سب اپنے دلوں کی شرارتوں اور اپنے اعمال کی خرابیوں کے مقابلے میں اللہ ہی کی پناہ طلب کرتے ہیں، جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جسے وہ ہدایت سے محروم کر دے اس کے لیے کوئی رہنما نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کہ جو ایک ہے اور جس کے ساتھ کوئی دوسرا حصہ دار نہیں، کوئی اور قابلِ عبادت و اطاعت ہستی نہیں! بلاشبہ بہترین بیان اللہ تبارک و تعالیٰ کی کتاب ہے۔ جس شخص کے دل کے لیے اللہ نے اس کو محبوب بنا دیا اور جسے کفر کے بعد اسلام میں داخل کیا اور جس نے اور سارے انسانی بیانوں کے مقابلے میں اسے اپنے لیے پسند کر لیا، اس نے فلاح پائی

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ صـ ۱۴۶

یہ بہترین بیان ہے اور سب سے زیادہ مؤثر۔ تم وہی کچھ پسند کرو جو اللہ کو پسند ہے اور اللہ سے اخلاص کے ساتھ محبت کرو۔ اللہ کے کلام سے تغافل نہ برتو اور تمہارے دل اس کے لیے سخت نہ ہونے پائیں چونکہ یہ حقیقت ہے کہ اللہ جو کچھ پیدا کرتا ہے اس میں سے بہتر کو چھانٹتا اور منتخب کرتا ہے۔ سو اس نے اعمال میں سے بہترین اور بندوں میں سے برگزیدہ ترین اور بیانوں میں سے پاکیزہ ترین کو متعین فرما دیا ہے۔ نیز انسانوں کو جو کچھ دیا گیا ہے اس سب میں سے کچھ حلال ہے، کچھ حرام۔ پس اللہ کی غلامی اختیار کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ قرار دو، اس کے غضب سے اس طرح بچو جیسا کہ بچنے کا حق ہے۔ اور اللہ کے حضور میں وہ سارے پاکیزہ اقوال سچ کر دکھاؤ جن کو تم اپنی زبانوں سے ادا کرتے ہو اور اللہ کی رحمت کے ذریعے ایک دوسرے سے محبت کا رشتہ استوار کرو۔ یقیناً اللہ ناراض ہوتا ہے اگر اس کے ساتھ باندھے ہوئے (ایمان کے) عہد کو توڑا جائے۔ اور تم پر سلامتی ہو[1]"

تقریر کے الفاظ جو روایات سے ملتے ہیں بہت مختصر ہیں اور آنحضورؐ کے خطاب بالعموم مختصر ہوتے تھے۔ لیکن مطالب کی جامعیت دیکھیے کہ وقت کے تمام اہم مسائل ان الفاظ میں بول رہے ہیں۔ تقریر میں اسلام کی دعوت بھی دی گئی ہے، قرآن کی تعلیم کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے، حلال و حرام کی تمیز پیدا کرنے کا درس دیا گیا ہے اور اصولی و مقصدی جذبۂ اخوت و رفاقت پیدا کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

ان دو تقریروں کے مطالعہ سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اجتماعی دعوت کی نئی لہر کس انداز سے اٹھائی گئی تھی۔ ایک طرف بنیادی نظریہ کا پیغام دیا جا رہا تھا اور دوسری طرف اسی نظریہ کی اسپرٹ کے ذریعے پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے سوسائٹی کو رہنمائی دی جا رہی تھی۔

اسلامی ریاست کی تاسیس تیسرا تعمیری اقدام ـــــ اور شاید سیاسی لحاظ سے سب سے بڑا تعمیری اقدام ـــــ یہ تھا کہ ریاست چلانے کے لیے مدینہ کے یہود و مشرکین اور مسلمانوں کی سوسائٹی کو ایک نظم میں پرو دیا گیا۔ اس نوعیت کی تنظیم معاشرہ کے لیے ایک تحریری معاہدہ استوار کیا گیا جس کی نوعیت درحقیقت ایک باقاعدہ تحریری دستور کی ہے۔ اس کو بجا طور پر دنیا کا پہلا تحریری دستور کہا جاتا ہے۔ ہم یہاں اس دستور کی دفعات پر بحث

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۱۴۶

نہیں کرنا چاہتے، البتہ اس کے چند اہم پہلوؤں کا خلاصہ بیان کر دیتے ہیں۔ اس دستوری معاہدے کے ذریعے نبیؐ اکرم نے جو کچھ حاصل کیا وہ یہ تھا۔

— مدینہ کے منظم ہونے والے معاشرے میں خدا کی حاکمیت اور اس کے قانون کو اساسی اہمیت حاصل ہو گئی۔

— سیاسی، قانونی اور عدالتی لحاظ سے آخری اختیار (AUTHORITY) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ آ گئی۔

— دفاعی لحاظ سے مدینہ اور اس کے نواح کی پوری آبادی ایک متحدہ طاقت بن گئی اور اس کے کسی عنصر کے لیے قریش کی حمایت کے دروازے بند ہو گئے۔ نیز دفاعی لحاظ سے بھی مرکزی اور فیصلہ کن اختیار آنحضور صلعم کے پاس آ گیا۔

اس دستوری معاہدہ سے باضابطہ طور پر اسلامی ریاست اور اسلامی نظام حیات کی تاسیس واقع ہو گئی[1]۔ اس زمانے کی حالات کی پیچیدگیوں کو سامنے رکھیں تو پھر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کارنامہ کتنے بڑے پیمانے کا کارنامہ تھا اور اس کے پس منظر میں ایک لامثال سیاسی بصیرت اور گفت و شنید کی مہارت کام کرتی ملتی ہے۔ یہ دستوری دستاویز بھی اور دوسرے معاہدات و معاملات اور جنگی منصوبے بھی ہمیں آگاہ کرتے ہیں کہ نبیؐ اکرم صرف ایک صوفی و درویش نہ تھے بلکہ اجتماعی معاملات کو سنبھالنے اور سنوارنے کے لیے ماہرانہ حکمت سے آراستہ تھے اور ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی پوری پوری صلاحیتیں رکھتے تھے۔

[1] یہ طاقت کوئی نصب العین سے کر اٹھتی ہے وہ ہمیشہ سب سے پہلے اسکی فکر کرتی ہے۔ عرب کی جماعت اسلامیہ کی بے سرو سامانی کو دیکھیے اور مدینہ کے اجنبی ماحول میں آکر چند اجڑے پجڑے افراد کا عالم ابتلا دیکھیے اور پھر ملاحظہ فرمائیے کہ کیسے اولین اسلامی ریاست کی فوراً تاسیس کی جاتی ہے اور کیسے چند مہینوں میں دستور بن کر نافذ ہو جاتا ہے۔ نسلی اور مذہبی لحاظ سے گوناگوں متضاد عناصر کو اتنا جلد ایک دستور پر متحد کر دکھانا تاریخ کا حیرت انگیز واقعہ ہے۔ اس سے مقابلے میں آج پاکستان کا حال دیکھیے کہ مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہے۔ ہر طرح کے ذرائع و وسائل اور تنظیمیں موجود ہیں لیکن آٹھ برس دستوری ڈھانچہ بننے میں لگ گئے اور اس میں بھی نصب العین کا معاملہ اب تک جھگڑے کا موضوع بنا رہا۔

نظامِ مؤاخات مدینہ کے معاشرہ کا ایک بڑا مسئلہ سینکڑوں مہاجرین کی بحالی کا مسئلہ تھا۔ گھر بار چھوڑ چھاڑ کر مسلسل لوگ اکھڑے چلے آرہے تھے اور چند ہزار کی آبادی رکھنے والی متوسط سی بستی کو انہیں اپنے اندر جذب کرنا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلے کو جو تاریخ میں جب بھی پیدا ہوتا ہے، پریشان کن بن جایا کرتا ہے، مدینہ کے معاشرے اور اس کے صدرِ ریاست نے جس کمالِ حکمت سے حل کیا اس کی کوئی دوسری مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ کوئی آرڈی ننس جاری نہیں کیے گئے، کوئی قانون نہیں ٹھونسے گئے۔ الاٹ منٹیں نہیں کی گئیں۔ مہاجرین کی تعداد معین کر کے کوئی قدغن نہیں لگائی گئی۔ کسی جبر سے کام نہیں لیا گیا محض ایک اخلاقی اپیل کے ذریعے اس پر پیچ مسئلے کو چند روز میں حل کر لیا گیا۔ سرورِ عالم نے عقیدے اور نظریے اور مقصد کی صحیح معنوں میں ایک نئی برادری پیدا کر دکھائی اور ایک ایک انصاری کے ساتھ ایک ایک مہاجر کا باضابطہ رشتہ قائم کر دیا۔ انصار کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے مال، مساکن، باغات اور کھیت آدھوں آدھ بانٹ کر رفقائے مقصد کو دے رہے تھے، بلکہ بعض تو یہاں تک تیار ہو گئے کہ دو دو بیویوں سے ایک ایک کو طلاق دے کر اپنے دینی بھائیوں کے نکاح میں دے دیں۔ دوسری طرف مہاجرین کی خودداری کا نقشہ یہ تھا کہ وہ کہتے تھے کہ ہمیں کھیت یا بازار کا راستہ دکھا دو، ہم تجارت یا مزدوری کر کے پیٹ پال لیں گے۔

مجرد، بالخصوص نو عمر مہاجرین جو اپنے آپ کو تعلیم کے لیے وقف کرنا چاہتے تھے ان کی اقامت گاہ "صُفّہ" (مسجد نبوی کا ایک چبوترہ) تھی۔ تعمیری کام کے سلسلے میں یہ ایک اہم ادارہ تھا۔ اصحابِ صفہ کی کفالت سوسائٹی کرتی تھی اور آنحضور صلعم خود ان کی ضروریات کی تکمیل میں سرگرم رہتے۔

پھر وہی کشمکش یہاں تاریخ و سیرت کے پورے سلسلۂ واقعات کو پیش کرنا مقصود نہیں ہے۔ مجملاً ہم نے یہ دکھانا چاہا ہے کہ تحریکِ اسلامی کی پود مکہ سے آکر مدینہ میں کس طرح نصب ہوتی ہے اور کس طرح نئی کونپلیں نکالنے لگتی ہے۔ ماحول کیا تھا اور اب ایک نئی موثر طاقت کے آجانے سے اس میں کس نہج پر نئی حرکات شروع ہو رہی تھیں۔ سوئے ہوئے معاشرے کو جس حق نے آکر جگا دیا تھا۔ عمل کا ایک اسٹیج تیار ہو گیا تھا، اور اس پر ایک مثبت اور تعمیری طاقت اپنا کردار پیش کر رہی تھی۔ مثبت کردار کے سامنے آتے ہی تاریخی قانون کا تقاضا یہ تھا کہ کوئی نہ کوئی منفی کردار بھی نمودار ہو۔ تعمیری مہم کے مقابل میں مثبت کا ضابطہ لازماً ایک

(بقیہ محسنِ انسانیت)

تخریبی طاقت کو حرکت میں لانا چاہتا تھا۔ حق اگر میدان میں آگیا ہو تو پھر ناگزیر تھا کہ باطل کے محاذ پر بھی گرماگرمی پیدا ہو جائے۔ عاشق جانباز اگر کوچۂ جاناں کی طرف اقدام کرے تو پھر رقیب روسیاہ کی ضرورت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ مدینہ میں جس نئے معاشرہ کی اٹھان ہو رہی تھی اسے دیکھ دیکھ کر شیطان بُری طرح تلملا رہا تھا۔ وہ اپنے کچھ خدا کملو تیاں نشاد میدان میں لانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسے آلہ بننے کا رول کٹنے لعدو وہ ان کو اٹھا کر اسٹیج پر لے آیا۔ تحریک کو پہلے سابقہ ابراہیم علیہ السلام کے نام لیواؤں سے تھا، اب اس کے مقابلے میں موسیٰ علیہ السلام کے جانشین جنہ پائے تقدس پہنے اور کتاب اللہ بغل میں لیے خراماں خراماں بڑھتے دکھائی دیئے۔ تحریک اسلامی کے ڈرامے میں پہلے جو پارٹ متولیانِ کعبہ نے ادا کیا تھا۔ اب مدینہ میں وہی پارٹ فرزندانِ بیت المقدس نے اپنے ذمے لیا۔ (باقی)